بسم الله الرحمٰن الرحيم

حکیم کمال الدین حسین ہمدانی
ایک عبقری شخصیت

مرتبہ
پروفیسر سید عراق رضا زیدی
سابق صدر شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

حکیم کمال الدین حسین ہمدانی ایک عبقری شخصیت

مرتبہ: پروفیسر سید عراق رضا زیدی
سابق صدر، شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروجیکٹ مینیجر: مجید احمدی
تزئین کار: عائشہ فوزیہ

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران
۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱
فون: 34-23383232، فیکس: 91-11-23387547
Email:newdelhi@icro.ir
Website: http://fa.newdelhi.icro.ir

فہرست

۱ دیباچہ ۷
☆ ڈاکٹر علی دہگاہی
۲ پیش گفتار ۹
☆ پروفیسر سید علی محمد نقوی
۳ اظہار تشکر ۱۱
☆ سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی
۴ تعارف ۱۵
☆ از جناب پروفیسر سید منظر عباس نقوی صاحب امروہوی
۵ صدراتی خطبہ ۲۱
☆ ڈاکٹر کریم نجفی
۶ حکیم کمال الدین حسین ہمدانی ایک عبقری شخصیت ۲۵

بسم الله الرحمن الرحیم

دیباچه

علی دهگاهی
مسئول خانهٔ فرهنگ
جمهوری اسلامی ایران دهلی نو

از راه خراسان و ماوراء النهر بود که اسلام به هند وارد شد و پرتو دانش در دوره اسلامی نیز از همان شهرها بر هند تابید و چون در آن نواحی از دیرباز حکمت و معرفت رواج داشت، بنابر این در هند نیز بیشترین عنایت به این علوم شده. هند در برهه هایی از تاریخ مرکز علوم زمان خود بود. دانشمندان از سرزمین های همجوار و مناطق دور و نزدیک به آن سوی روی می آوردند و صاحبان فضل و کمال از هر ناحیه به آن صوب می شتافتند و مجلس بحث و فحص و افاده و تدریس در هر جا برپا بود.

فضلا و علمای زیادی نیز از ایران به هند مهاجرت می کردند و بساط علم و دانش و زبان فارسی و تبلیغ دین بواسطهٔ آنها در تمام هند گسترده بود. بنابر این سرزمین فرهنگ پرور هند نیز همچون ایران بهشت آیین، اندیشمندان و فرهیختگان ارجمندی را در دامن خود پرورانده. هر یک از این بلندپایگان و عالی مقامان عرصه علم و ادب خدمات درخوری را برای بارورشدن نهال دانش و معرفت شرقی متحمل شده اند و چه مرارت ها و سخت کوشی هایی که در این راه بر خود هموار کرده و صد البته ثمرهٔ شیرین

آن را به جامعه بشریت پیشکش نموده‌اند. تاریخ تمدن جهانی هرگاه که نام، نام‌آوران ایران و هند را به یاد می آورد باید به احترام آنها تمام قامت ایستاده و سر تعظیم فرود آورد.

اگر کارشناسی و صنعت عصر مدرنیسم مرهون خدمات خردورزان و دانشمندان غربی است، در عوض ما شرقی‌ها باید به خود ببالیم که شعر، عرفان و معرفت پر رمز و راز شرقی نیز محصول حیات دیرینه تمدن‌های آسیایی و اندیشه‌های متعالی برخاسته از ادیان الهی و فرهنگ‌های ژرف مکانی است.

گرامی داشت یاد این فرهیختگان علم و دین کمترین قدردانی است که بر دوش ما متولیان فرهنگی است. بر این اساس خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران در دهلی نو برای پاسداشت یاد و خدمات این مشاهیر، ویژه برنامه‌هایی را برگزار و یا آثاری را از این اندیشه‌گران منتشر می‌کند.

حکیم سید کمال الدین حسین همدانی یکی از این فرهیختگان معاصری است که خدمات درخوری را برای علم طب سنتی در هند انجام داد. او عمر پربار خود را صرف آموزش و پژوهش در علم طب نمود. شاگردانی را پرورش داد و آثار ارزشمندی نیز تألیف کرد. خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران در دهلی نو به پاسداشت خدمات این محقق ارجمند، ویژه برنامه یادبودی را با همکاری بخش شیعه شناسی دانشگاه اسلامی علیگره برگزار کرد و همچنین یکی از آثار ایشان به نام «تشریح جعفری»، که درباره امام جعفر صادق(ع) بوده را منتشر کرد. مجموعه حاضر نیز محصول سخنرانی‌هایی است که از سوی محققان در برنامه بزرگداشت ایشان در دانشگاه اسلامی علیگره ارائه شد و هم اینک در مجموعه حاضر به زیور طبع آراسته می‌شود.

در خاتمه لازم است از پروفسور عزیز الدین حسین همدانی فرزند گرامی حکیم سید کمال الدین که از اساتید برجسته و کوشای تاریخ در دانشگاه ملیه اسلامی است، قدردانی نمایم.

❁❁❁

پیش گفتار

پروفیسر سید علی محمد نقوی
صدر شعبہ شیعہ دینیات، وڈین، فیکلٹی آف تھیولوجی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شیعہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک اہم شعبہ ہے گذشتہ کچھ عرصے سے یہ ایک بڑے علمی اور تحقیقاتی مرکز کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ گزشتہ دو سال کے اندر تین انٹرنیشنل سمینار اور مختلف سمپوزیم اور Extension Lecture منعقد ہوئے۔ ہمارے اساتذہ کی کتابیں نشر ہو رہی ہیں، طلباء کی تعداد میں برابر خاصہ اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک تازہ ڈولپمنٹ یہ ہے کہ ہمارے MTh اور Ph.D کے کورسیز میں غیر ملکی خصوصاً ایرانی طلبا کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ سب اللہ سبحانہ کی مدد اور ہمارے ساتھیوں کی محنت سے ممکن ہو پایا۔

موجودہ سمپوزیم شعبہ شیعہ دینیات کی طرف سے ہونے والا تیسرا اہم علمی پروگرام ہے۔

آج کا سمپوزیم ''پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی صاحب مرحوم کے علمی کارناموں'' سے متعلق ہے۔ علمی مراکز کا ایک اہم کام مختلف شخصیتوں کی علمی خدمات کو سراہنا اور ان کی کتابوں اور آثار کا احیاء کرنا ہے۔ حکیم کمال الدین ہمدانی صاحب کی شخصیت

پر ابھی زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔لیکن ان کی تصنیفات پر ایک طائرانہ نظر سے بھی واضح ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اسلام اور طب دونوں شعبوں میں اہم خدمات انجام دیں۔ہم سب کو علم ہے کہ قدیم دور میں دینی دارالعلوم اور حوزوں میں طب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ایک نسل پہلے تک حکیم ہونے کے لئے فارسی اور عربی کا منتہی ہونا ضروری تھا۔کہا جاتا ہے کہ حکیم نصف مجتہد ہوتے ہیں۔

حکیم کمال الدین ہمدانی صاحب بھی فیکلٹی آف یونانی طب اور فیکلٹی آف تھیولوجی ،علی گڑھ مسلم یونیوسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور پھر طب میں استادی کے منصب پر فائز ہوئے۔حکیم اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیوسٹی علی گڑھ میں ایک عرصے تک شعبہ کلیات کے چیرمین بھی رہے۔طب میں انکی دو کتابیں اصول طب اور تذکرہ اطبائے اودھ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔اصول طب تو ہندوستان اور پاکستان کے تمام طبیہ کالجوں کے نصاب کا حصہ ہے موصوف ساری زندگی علمی کام انجام دیتے رہے۔آج بھی ان کا یہ کام طالبان علم کے لیے مشعل راہ بنا ہوا ہے۔جس پر صرف ریسرچ اسکالر ہی نہیں دانشور اور محقق بھی کام کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جلالی سے روشن ہونے والی اس شمع کا نور اسلامی ادب،علم طب، اور اردو ادب کی روشنی میں اضافہ کا سبب بنتا رہے گا۔

اظہار تشکر

سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی
ڈین، فیکلٹی آف ہیومنیٹز اینڈ لنگویجز
اور ڈائریکٹر، پریم چند آرکائیوز
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

شکریہ ادا کرنا اسلام کا ایک اہم جزو ہے۔ لہذا میرا فرض ہے کہ میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کروں کہ جنھوں نے والد مرحوم پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی (وفات ۲۱ر فروری ۲۰۰۶ء) کی برسی پر منعقد سمپوزیم کامیاب بنانے میں میری مدد کی۔ میں پروفیسر سید علی محمد نقوی صاحب ڈین فیکلٹی آف تھیولوجی وصدر شعبہ شیعہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اپنی فیکلٹی کے قدیم طالب علم اور یونیورسٹی کے دانشور پر ایک سمپوزیم ''پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی کی علمی خدمات'' کا انعقاد فیکلٹی آف تھیولوجی میں کرایا۔ جناب ڈاکٹر کریم نجفی صاحب، کلچرل کاؤنسلر، ایران کلچر ہاؤس، اسلامی جمہوریہ ایران، نئی دہلی کے تعاون سے یہ سمپوزیم منعقد ہوا ڈاکٹر نجفی نے یہ شرط رکھی کہ آپ مجھے جلالی بھی لے چلیں گے۔ اسلئے کہ انھیں میرے والد مرحوم کی قبر پر فاتحہ

پڑھنی تھی۔جن کے وہ بڑے قدر دان ہیں۔لہذا انہیں جلالی لے کر گیا۔ والد مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھی پھر سید شاہ خیرات علی ہمدانی کی قبر پر فاتحہ پڑھی اسکے بعد میں انکو مولانا سید مکرم حسین مجتہد کی قبر پر لے کر گیا وہاں انہوں نے فاتحہ پڑھی پھر امام باڑہ سید شاہ خیرات علی تشریف لائے اسکے بعد سید قیصر حسین مرحوم کے تعمیر کردہ مدرسہ میں لے کر گیا ڈاکٹر نجفی نے بچوں سے انکا سبق سنا اور بچوں میں مٹھائی تقسیم کرائی۔ پھر سلطان غیاث الدین بلبن کی تعمیر کردہ مسجد لے کر گیا وہاں انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی اور مسجد کی حالت دیکھ کر سادات جلالی کی ستائش کی۔

۱۲ر فروری ۲۰۱۱ء کو سمپوزیم کا انعقاد صبح ۱۰/۳۰ بجے ہوا۔اس سمپوزیم میں والد مرحوم کے احباب اور شاگردوں پروفیسر سید عراق رضا زیدی، سابق صدر شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ڈاکٹر سید لیاقت حسین معینی اسوسی ایٹ پروفیسر سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈی ان ہسٹری مسلم یونیورسٹی پروفیسر انیس احمد انصاری صاحب سابق صدر شعبہ کلیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے والد مرحوم کی مختلف موضوعات پر کتابوں کا احاطہ کرتے ہوئے مقالے پیش فرمائے۔ میں ان تمام مقالہ نگار حضرات کا شکر گذار ہوں۔ میں تمام علماء ،دانشوروں طلبا وطالبات کا شکر گذار ہوں کی جنکی شرکت اس سمپوزیم کی کامیابی کا سبب بنی۔ اپنے تمام اعزاء خاص طور سے سید محمد سبطین صاحب ڈاکٹر سید تفسیر علی جعفری صاحب، سید اعظم حسین صاحب، سید صابر رضا صاحب، سید محمد ابراہیم صاحب، سید رضا امام صاحب، سید محمد مہدی صاحب، سید علی عباس صاحب اور سید محمد مسیح الدین حسین ہمدانی کا شکر گذار ہوں کہ جنکی شرکت نے اس سمپوزیم کو رونق بخشی پروفیسر سید عراق رضا زیدی صاحب کا مضمون شائع کر رہا ہوں تا کہ دانشوروں اور عام لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ والد مرحوم نے کس طرح کی علمی خدمات انجام دی تھیں اور علمی دنیا میں علماء اور دانشوروں کی نظر

میں والد مرحوم حکیم کمال الدین ہمدانی کا کیا مقام ہے۔علمی دنیا آج بھی ان کے ان علمی کاموں کی مداح ہے۔ان کی کتاب اصول طب ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے تمام طبیہ کالجوں میں نصاب کا حصہ ہے اور اساتذہ اور طلبا اس سے مستفیض ہو رہے ہیں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم ہے۔''علماء کے دوات کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے'' جمعہ ۱۲ ستمبر ۲۰۱۱ء کو آقای علی جیحونیان۔صداوسیمای ہمدان ایران سے میر سید علی ہمدانی پر ڈکومینٹری بنانے ہندوستان آئے تھے انھیں میرا انٹرویو لینا تھا تو میں اپنے ساتھ میر سید علی ہمدانی کی ذخیرۃ الملوک اور مودۃ القربی لے گیا اور ساتھ ہی والد محترم کی صاحب مودۃ القربی بھی تھی اسمیں سے انکے کچھ اقتباسات پڑھ رہا تھا جس میں ان کا ایک خط میرے نام بھی تھا۔آقای علی نے یہ خط دیکھا تو کہا کہ یہ نہایت خوشخط کس کا ہے میں نے کہا والد محترم کا ہے انہوں نے وہ خط مجھ سے لیکر چوما اور کہا کہ اگر آپ یہ خط مجھے دیدیں تو میں اسکو ہمدان کے میوزیم میں رکھونگا۔میں نے وہ خط انکو دیدیا علم اور علماء کے قدر دان ایسے ہوتے ہیں۔ ہندوستان اور ایران کی علمی دنیا میں والد مرحوم کی بڑی عزت ہے۔ اور آج بھی ہندوستانی اور ایرانی دانشور انکے نام کو بڑی عقیدت سے لیتے ہیں۔

۲۱ فروری ۲۰۱۱ء

❁❁❁

تعارف

حکیم سید محمد کمال الدین حسین بہ حیثیت مرثیہ نگار

از جناب پروفیسر سید منظر عباس نقوی صاحب امروہوی
سابق چیئرمین شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اردو کی کلاسیکی شاعری باستثناء نظیر اکبرآبادی چار بڑی اصناف پر مشتمل ہے یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ۔ نظیر کو مستثنیٰ اس لئے قرار دیا گیا کہ انھوں نے روش عام سے ہٹ کر مربوط انداز میں مختلف موضوعات پر نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر ادبی حلقوں میں ان نظموں کو استناد و اعتبار کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ اس لئے شیفتہ اپنے تذکرہ میں نظیر کو سوقیانہ شاعر کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ ادبی حلقوں کی ساری توجہ غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر مرکوز رہی۔

مثنویاں منظوم داستانیں تھیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ جب داستانی دور ختم ہوا تو اس انداز کی مثنوی نگاری بھی ختم ہوگئی اور یہ مثنویاں اگرچہ بڑی قدر و قیمت کی حامل ہیں

لیکن ان کا موضوع یکسر مختلف ہے۔ بیسویں صدی کی یہ مثنویاں خواہ وہ اقبالؔ کا ساقی نامہ ہو یا جمیلؔ مظہری کی آب وسراب بس اس حد تک مثنویاں ہیں کہ ان میں مثنوی کی ہیئت کو برتا گیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ مربوط نظمیں ہیں جن میں کسی فکری موضوع پر شاعر نے اظہار خیال کیا ہے۔

یہی حال قصیدہ کا ہوا۔ قصیدہ درباروں کی پیداوار تھا۔ جب دربار نہ رہے تو قصیدہ بھی خود بخود ختم ہو گیا۔

اب دو ہی کلاسیکی شعری اصناف ایسے ہیں جو آج بھی باقی ہیں اور جن میں شعراء برابر طبع آزمائی کر رہے ہیں یعنی غزل اور مرثیہ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں صنفیں جن جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں وہ آفاقی حیثیت رکھتے ہیں اور زمان ومکان کی قید سے آزاد ہیں۔ جذبۂ عشق ہو یا جذبۂ غم انسانی زندگی میں دونوں کی کارفرمائی اسی طرح جاری وساری ہے جس طرح اب سے سیکڑوں برس پہلے تھی۔

جذبات انسانی میں جذبۂ غم بڑا ہمہ گیر جذبہ ہے۔ کونسا دل ہے جو اپنے کسی شفیق بزرگ، کسی چہیتے دوست، کسی عزیز قریب کی موت پر متاثر نہ ہوا ہوگا۔ کونسی آنکھ ہے جو اتلاف جان ومال پر آج بھی آبدیدہ نہ ہوتی ہو۔ بقول غالبؔ جیتے جی بند غم سے نجات ممکن نہیں پھر وہ غم جس کا تعلق ان ہستیوں سے ہو جنھوں نے اپنے دینی اور روحانی فیوض سے انسانی زندگی کو بابرکت بنایا ان کا غم ایسا غم نہیں ہے جو بھلایا جا سکے ایسی ہی جلیل القدر شخصیتوں میں سے ایک شخصیت سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی ہے جنھوں نے انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں کی حفاظت کے لئے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کی جانیں دس محرم ۶۱ھ کو میدان کربلا میں قربان کر دیں۔ یہ وہ ناصران حق تھے جنھوں نے کلمۂ لا الٰہ الاّ اللہ صرف زبان ہی سے نہیں کہا بلکہ اپنے عمل سے ثابت کر دکھا

یا۔ جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کے سر نیزوں پر بلند تو ہو سکتے ہیں لیکن غیر اللہ کے سامنے جھک نہیں سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعہ کربلا انسانی تاریخ کا وہ عظیم المیہ ہے جس کی یاد ہر ملک' ہر زمانے اور ہر زبان میں اپنے اپنے انداز میں منائی جاتی رہی ہے۔ یہ اس واقعہ کی اثر انگریزی ہی ہے کہ اردو میں مرثیہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ اردو شاعری کی۔ مذاق وقت کے مطابق اس کی ہیئتیں بدلتی رہیں، اسالیب بدلتے رہے، موضوعات میں اضافے ہوتے رہے لیکن مرثیہ بہر حال برقرار رہا یہاں تک کہ دور حاضر میں بھی جبکہ دینی رجحان میں کمی پیدا ہوگئی ہے جہاں جہاں اردو کا رواج ہے اور لوگ اس زبان میں شاعری کر رہے ہیں وہاں مرثیے بھی لکھے جا رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی کی شاعری پر مولانا الطاف حسین حالؔی کے مقدمہ کا بڑا اثر ہوا ہے۔ یہ اثر صرف غزل تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ مرثیہ گو شعراء نے بھی اپنے مضامین میں وسعت پیدا کی اور مرثیہ کو قومی اصلاح وتہذیب کا وسیلہ بنایا۔ شادؔ عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی اور سید آل رضا وغیرہم کے مراثی روایتی مرثیے سے یکسر انحراف تو نہیں کرتے لیکن عہد حاضر کے مسائل کی ترجمانی کی بنا پر ان کو کلاسیکی مرثیہ کی ایک توسیع کہا جا سکتا ہے جس میں جدت بھی ہے اور انفرادیت بھی شاید انہی خصائص کی بنیاد پر ان مراثی کو ''جدید مراثی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مرثیہ، اس لئے بھی ایک زندہ صنف ہے کہ عزاداری امام حسین علیہ اسلام کا ایک حصہ ہے۔ امام حسینؑ کی عزاداری بحمداللہ آج بھی فروغ پر ہے۔ مجلسیں ہو رہی ہیں، سوز خوان ہوں یا پیش خوان مرثیے پڑھے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ کہ وہ قصبات جو عزاداری کے لئے مشہور ہیں وہاں آج بھی لوگوں کے کان مرثیوں سے آشنا ہیں۔ ایسی صورت حال سے

شعراء کی حوصلہ افزائی ہورہی ہے۔اور جابجا مرثیے تصنیف ہورہے ہیں۔ ہندوستان کی ان قدیم بستیوں میں سے جوعزاداری کے لئے مشہور ہیں جلاؔلی ضلع علی گڑھ بھی ایک ایسا ہی مقام ہے جسے تاریخ عزاداری میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا میرے محترم دوست پروفیسر ڈاکٹر سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی صاحب جن کے مراثی کا یہ مجموعہ آپ کے پیش نظر ہے اگر چہ زندگی بھر پیشۂ طبابت اور معلّمی سے وابستہ رہے لیکن بڑا ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے اور مختلف اصناف شعر میں طبع آزمائی کی۔انھوں نے مرثیہ گوئی نہ شہرت کے لئے کی ہے نہ مالی منفعت کے لئے بلکہ اس کا محرک صرف یہ جذبہ ہے کہ شاعری کے ذریعے حسینی مشن کی تبلیغ چاہتے تھے اور اس عمل کو اپنے لئے وسیلۂ نجات جانتے تھے اور شاید اسی مناسبت سے اس مجموعہ کا نام ''فکرنجات'' رکھا ہے۔

یہ مجموعہ ڈاکٹر کماؔل ہمدانی صاحب کے پانچ مراثی پر مشتمل ہے اس میں پہلا مرثیہ فارسی کے مشہور مرثیہ نگار محتؔشم کا شانی کے معرکتہ الآرا مرثیہ کی ہئیت ترکیب بند میں ہے۔ محتشم کا مرثیہ فارسی اور اردو کے رثائی ادب میں اتنا مقبول ہوا کہ مختلف زمانوں میں شعراء نے اس کے تتبع میں مراثی لکھنے کی کوشش کی چنانچہ میر تقی میؔر نے ایک مرثیہ بارہ بندوں پر مشتمل ترکیب بند کی ہیئت میں لکھا اور وہی زمین اختیار کی جو محتؔشم کے یہاں ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مرثیہ لکھتے وقت محتؔشم کا شانی اور میر تقی میؔر دونوں کے مراثی ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر رہے ہیں۔

اس مجموعے میں ڈاکٹر صاحب کا وہ مرثیہ بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے جس کا مطلع ہے:

وہ کون سا عمل ہے کہ ہے باعث نجات

اس مرثیہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے نماز کی فضیلت پر زور دیا ہے۔حقیقت

یہ ہے کہ امام حسینؑ سے محبت کا حق صرف اسی صورت میں ادا ہوسکتا ہے کہ ہم نماز کی اہمیت کو سمجھیں، حسینؑ کا وہ آخری سجدہ جو عصر عاشورہ کو کربلا کی تپتی ریت پر خنجر شمر کے نیچے ادا ہوا، وہ ہمیں نماز کی اہمیت کو ہمیشہ ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے حسینی سیرت کے اس پہلو کو بھلا دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مرثیہ میں نماز کی فضیلت پر جو زور دیا ہے اس کا مقصد یہی بتاتا ہے کہ محبت اہلبیتؑ اور نماز ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ یہ دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔

اس مجموعہ میں وہ مرثیہ بھی موضوع کے اعتبار سے بڑی انفرادیت کا حامل ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے آنسو کے طبی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ رونا بشری فطرت کا ایک حصہ ہے اور فطرت کا کوئی عمل لایعنی نہیں ہوتا۔ اس مرثیہ کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اگر زبان پر قدرت رکھتا ہو تو کس طرح غیر شاعرانہ موضوعات کو شاعری بنا سکتا ہے۔

ان مراثی کے علاوہ اس مجموعہ میں چند رباعیات وقطعات وسلام بھی شامل ہیں جن سے ڈاکٹر ہمدانی صاحب کی قادرالکلامی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ یہ مراثی اردو کے رثائی ادب میں ایک ایسا اضافہ ہیں جس سے ہم کسی طرح صرف نظر نہیں کرسکتے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ کلام صاحبان ذوق ونظر کے حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور مقبول ہوگا۔

❁❁❁

صدراتی خطبہ

ڈاکٹر کریم نجفی
کلچرل کاؤنسلر
سفارت جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی

ایران کی قدیم تاریخ اور تہذیب سے معلوم ہوتا ہے کہ طب اسلامی/علم حکمت کو وجود میں لانے کے سلسلے میں ایرانیوں کا دیگر اقوام اور تہذیبوں کے مقابلہ زیادہ اہم کردار رہا ہے۔ اعداد وشمار سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیبی دور میں ایران میں حکیموں کی خاصی تعداد رہی ہے اور حکمت سے متعلق یہاں اہم کتابیں بھی ایرانیوں ہی کے ذریعے لکھی گئیں، اسلامی دور کے معروف حکیموں میں محمد بن زکریا رازی (۲۵۱۔۳۲۲ھ ق)، علی بن عباس مجوسی اہوازی (تقریباً ۴۰۰) اور شیخ الرئیس ابوعلی سینا (۳۷۰۔۴۲۸ھ ق) کے نام قابل ذکر ہیں انھیں کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ، قانون ابن سینا، کی شکل میں ایرانیوں کے توسط سے ہندوستان کی سرزمین پر جو خود بھی علم وحکمت کا ایک اہم مرکز رہا ہے منتقل ہوا اور یہ کارنامہ علم حکمت میں ایک اہم کتاب کی شکل میں انجام دیا گیا۔

یہ بات لائق ذکر ہے کہ ظہور اسلام سے قبل علم طب، طب یونانی، طب ایرانی اور

طب ہندی آپس میں مخلوط تھے،لیکن طب یونانی قدیمی ہونے کے سبب ایران میں زیادہ اثر انداز رہا۔درحقیقت یہ بات لائق توجہ ہے کہ اگر تمام ملتوں کے علوم کی قدیمی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو سب سے قدیمی تاریخ علم حکمت کی ہی نظر آئیگی جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے، ''**لقد خلقنا الا نسان فی کبد**'' انسان رنج وغم و پریشانی کے ساتھ اس دنیا میں آیا ہے اور جس دن سے انسان اپنے غم اور درد کو دور کرنے کے واسطے خود کوشاں ہوا یا پھر کسی دوسرے کے پاس گیا وہیں سے طب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے، یہ بات واضح ہے کہ وہ پہلا شخص جو اس سلسلے میں کامیاب ہوا وہ انسان پہلا طبیب تھا۔ یہاں تک کہ انسان اپنی عزیز جان کی خاطر کسی طبیب سے ملاقات کرتا ہے اور اس کے علاج پر پورا یقین کرتے ہوئے درد وغم کو دور کرنے کے لئے اقدامات کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام وہ پہلے شخص تھے کہ جن کو خداوند عالم نے انسانوں کی مادی اور معنوی زندگی کی ہدایت کے لیے مقرر کیا جیسا کہ ارشار فرمایا **العلم علمان علم الادیان و علم الابدان** پیغمبران انسانوں کی بیماریوں کو دور کرنے خاص طور سے روحی اور معنوی بیماریوں کے سلسلے میں کوشاں رہیں جیسا کہ حدیث میں پیغمبر اکرم (ص) کا ارشاد ہے: **طبیب دوار بطبہ**، ایران اور ہندوستان کے تہذیبی وثقافتی رشتے تیموری دور میں اور خصوصاً جلال الدین اکبر (۹۶۳۔۱۰۱۴ھ) کے عہد میں نہایت محکم و مستحکم ہوئے یہاں تک کہ ایران کے مشہور ومعروف حکیموں کو دربار اکبری میں نہایت عزت واحترام حاصل ہوا۔ان حکما، کے درمیان ایک حکیم علی گیلانی ملقب بہ جالینوس تھے، یہ اکبر شاہ کے مخصوص حکیم تھے ان کو علم طب کے علاوہ دیگر عصری علوم پر بھی دسترس حاصل تھی اور کتاب شرح قانون ابن سینا بھی آپ ہی سے منسوب ہے اسی طرح میر فتح اللہ شیرازی جو علم طب، نجوم، ستارہ شناسی، حساب وغیرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ جب آپ کا انتقال ہوا اکبر شاہ نے بہت گریا کیا

اور بار ہا یہ بات کہی کہ زمانہ ایک اچھے حکیم نجومی اور طبیب کو کھو بیٹھا اور کون میرے اس درد وغم کا اندازہ کرسکتا ہے؟ اکبر شاہ کا کہنا تھا اگر وہ فرنگیوں کے ہاتھوں اسیر ہو جاتا اور اس کو آزاد کرنے کے عوض تمام شاہی خزانہ بھی طلب کیا جاتا تو میں با خوشی رہائی کے بدلے بخش دیتا اور مجھے یقین تھا کہ مجھے اس کام میں زیادہ فائدہ حاصل ہوتا۔ بہر حال اس بے پناہ توجہ اور قدر دانی نے ہندوستان میں طب اسلامی کے فروغ میں اہم کردار نبھایا یہاں تک کہ ہندوستان کی تمام ریاستوں میں بڑے بڑے حکیم پیدا ہوئے ان صوبائی ریاستوں میں ایک ریاست اودھ ہے کہ جس کا مرکز لکھنؤ تھا، لکھنؤ میں نوابین کے دور میں طب اسلامی کو بہت زیادہ فروغ ملا۔

پروفیسر حکیم کمال الدین حسین ہمدانی کے ذریعے لکھا گیا تذکرہ بنام ''تذکرہ اطباء اودھ'' ایک بیش قیمت لاثانی تذکرہ ہے جس میں سرزمین اودھ کے ان حکماء کا تذکرہ ہے جنہوں نے اس سلسلے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اطبائے اودھ پر یہ پہلا کام ہے اسلئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ایک مرتبہ حکیم کمال الدین صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا وہ ایک شفیق بزرگ، عالم اور اخلاق اسلامی سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نبیان گزاروں میں سے ایک تھے، آپ نے طب اسلامی کے فروغ میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

اگر چہ آپ اپنی حیات میں اس کتاب کو زیور طباعت سے آراستہ نہیں کر سکے لیکن آپ کے دانشمند فرزند اور معروف ہندوستانی مورخ پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی، ڈین فیکلٹی آف ہیمونٹیز اینڈ لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے اس قیمتی کام کو شائع کیا۔ ۲/ اردی بہشت ۱۳۸۹ کو جناب پروفیسر علی محمد نقوی صدر شعبہ شیعہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی

گڑھ نے ایک سیمینار حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی کے سلسلے میں کیا تھا۔ جس میں ملک کے معروف اسکالرس، دانشور اور طبیہ کالج کے ذمہ دارارن نے حکیم کمال الدین حسین کے سلسلے میں اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا اور مقالات پڑھے۔

اس پروگرام کے اختتام پر میں جناب پروفیسر عزیز الدین حسین کے ہمراہ ہندوستان کے معروف تاریخی قصبہ جلالی گیا اور وہاں مرحوم پروفیسر کمال الدین ہمدانی کے مزار کی بھی زیارت کا شرف حاصل ہوا آخر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب پروفیسر عزیز الدین حسین کا کہ جو ہمیشہ اس طرح کے کاموں میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور خاص طور سے اس سیمنار کے مقالات کو نشر کرنے کے سلسلے میں جو'' حکیم کمال الدین حسین ہمدانی ایک عبقری شخصیت'' کے عنوان سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عمل میں آیا دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم کمال الدین حسین ہمدانی
ایک عبقری شخصیت

ہم بزرگوں کی روش چھوڑ دیں ناممکن ہے اس نئے دور میں پہچان رہے یا نہ رہے

خدا کے فضل سے تہذیب وتمدن کائنات کا وہ عظیم سرمایہ ہے جس پر گامزن رہ کر انسان نے انسانیت سے آشنائی حاصل کی ہے۔ اہل مغرب کے انکشافات اپنی جگہ، ہماری پیغمبری روایات قرآن واحادیث رسول اور نہج البلاغہ کی قرات میں موجود ہے۔ جو ہمیں محمدؐ کے ذریعے عملی طور پر وراثتاً حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے بزرگ، علماء دانشور اور مفکر اس کے پاسدار و پاسبان رہے ہیں۔ مراجع عالم نے بدلتے ہوئے وقتوں کے ساتھ ساتھ اس دور کی ضرورت کے مطابق قرآن واحادیث کی روشنی میں اسے سنوارا اور نکھارا ہے۔ یہ اسلامی ومقامی تہذیبیں دنیا کی کسی بھی تہذیب کا سامنا کرنے کو تیار ہیں۔ خصوصاً سائنس

اورٹکنالوجی کے بہترین اور بدترین دور میں بھی ہمارے بزرگوں نے اپنی شفقت اور محنت سے اس میں چار چاند لگائے ہیں۔ مجلس امام حسینؑ اور ان کے تعزیہ داروں اور محبت کرنے والوں نے اس شناخت کو قائم ودائم رکھا ہے۔ بیسویں صدی کے بعد اکیسویں صدی پرانی روایتوں کو مٹانے کی صدی معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان میں جس سے ہر قوم وملت اپنے تشخص کے لئے نبرد آزما ہے۔ لیکن ہمارے پاس ایک ایسی روایت بھی ہے جو نہ مٹ سکتی ہے اور انہ مٹائی جاسکتی ہے۔ جو ہمیشہ بزرگوں کے ذریعہ ہونے والے بزرگوں یعنی بچوں اور جوانوں کی روح میں گھٹی کے ساتھ شامل کردی جاتی ہے۔ جسم پر زنجیر، ماتم اور آگ کے داغ اسے روشن رکھتے ہیں۔ نوحوں، مرثیوں اور سلاموں کے کہنے کا چلن عام رہتا ہے۔ اور یہ تہذیب اور روایت ہر اس قصبہ کی شان ہے جہاں حسینی بستے ہیں ایسی بستیاں ہندوستان میں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ شہر سرسید کے قریب بھی ایک ایسی ہی بستی جلالی کے نام سے معروف ہے۔ جہاں میر سید علی ہمدانی کی نسل سے سید کمال الدین ہمدانی تقریباً ۱۵۳۰ء میں کشمیر سے ہجرت کر کے وارد جلالی ہوئے تھے جیسا کہ اس قصبہ کے مشہور ومعروف شاعر استاد قمر جلالی نے فرمایا ہے:

سید علی ہمدانی کے راحت جان ونور العین
ہند میں تبلیغ دین کو گھر سے چلے تھے چھوڑ کر چین
قصبہ جلالی کے سیدان ہی کی اولاد میں ہیں
مورث اعلیٰ ہیں وہ سب کے میر کمال الدین حسین

جلالی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ہندوستان میں عزاداری کے خاص محرک وعلمبردار شجاع الدولہ بہادر نے بھی اس قصبے میں عزاداری کی ہے اس قصبے نے خاصی تعداد میں علماء، اطباء، شاعر اور دانشور پیدا کئے ہیں۔ خصوصاً قطب العارفین سید شاہ خیرات علی

ہمدانی کی نسل میں خاصے مشہور ومعروف اطباء، شاعر اور دانشور ہوئے ہیں۔موصوف کے بنوائے ہوئے امام باڑے پر بھی نواب آصف الدولہ کی خاص عنایت رہی اور پانچ گاؤں برائے نذر ونیاز ائمہ معصومین وقف کئے، سادات جلالی نے ایک مجتہد بھی دیا مولانا سید مکرم حسین مجتہد نے اپنے دور میں علمی کارنامے انجام دیئے۔ اسی مہذب ومعروف خاندان میں اپنے مورث اعلیٰ میر سید کمال الدین حسین کے نام سے منسوب پروفیسر سید کمال الدین حسین نے خاندانی وقار وجلالت کو قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔آپ کی شخصیت ایک ادارے سے کم نہ تھی۔خود بھی علمی کاموں میں متحرک رہتے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے۔ خدا کی خاص نوازشات ان کا طواف کرتیں مثلاً وہ ایک وقت میں عالم، شاعر، مؤرخ، متولی، ناقد اور دانشور تھے۔ یہ صرف زبانی یا قلمی دعویٰ نہیں ہے بلکہ ان کی تحریر کردہ کتابیں اس دعوے کی صداقت کے لئے کافی ہیں۔

حکیم صاحب ۱۹۲۹ء میں اپنے والد حکیم سید محمد ریاض الدین حسین ہمدانی کے آبائی مکان قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہائی اسکول مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول علی گڑھ سے کیا۔ ۱۹۵۲ء میں بچلران یونانی طب اینڈ سرجری کی ڈگری اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی اور اسی سال یکم اگست ۱۹۵۲ء کو ڈیمونسٹریٹر تشریح کی پوسٹ پر مامور ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں لیکچرار تشریح اور ۱۹۶۵ء میں لیکچرار کلیات طب مقرر ہوئے۔ یکم اپریل ۱۹۷۲ء کو ریڈر ان کلیات اور یکم جنوری ۱۹۸۳ء کو پروفیسر ان کلیات کی حیثیت سے عروج پایا۔ دورانِ ملازمت یکم اپریل ۱۹۷۶ء کو صدر شعبۂ طب وجراحت کی پر وقار حیثیت حاصل ہوئی اور ۲۲/ جنوری ۱۹۸۳ء شعبۂ طب وجراحت تین شعبوں میں تقسیم ہوا تو آپ کو شعبۂ کلیات کا چیرمین مقرر کیا گیا نیز بحیثیت صدر وچیرمین شعبۂ طب وجراحت اور بعدہ شعبۂ کلیات فیکلٹی آف میڈیسن، بعدہٗ فیکلٹی آف

یونانی میڈیسن اورا کیڈمک کونسل کے ممبر رہے اور ۱۹۸۳ء میں کورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ممبر بھی رہے، ساتھ ہی ورکنگ کمیٹی آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے ممبر بھی رہے۔

دوران ملازمت تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں جامعہ اردو علی گڑھ سے امتحان ادیب کامل پاس کیا اور ۱۹۷۰ء میں بی ٹی ایچ اور ۱۹۷۱ء میں ایم ٹی ایچ کے امتحانات میں فرسٹ ڈیویژن اور فرسٹ پوزیشن سے کامیابی حاصل کی اور اس نمایاں کامیابی کے سلسلے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نقرئی تمغات حاصل ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں مقالہ ریسرچ بعنوان علاّمہ سید غلام حسنین کنتوری کی حیات اور کارنامے'' مکمل کیا جس پر پی، ایچ۔ ڈی کی ڈگری فیکلٹی آف تھیولوجی' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دستیاب ہوئی۔

ادارۂ ہمدانیہ جلالی ضلع علی گڑھ کے فروغ کے لیے بھی کوشش کی اور اس ادارہ سے متعدد کتب شائع کیں۔ اس کے علاوہ کتب خانہ سید خیرات علی کی ترتیب وتدوین بھی کی اور معتدد کتب ورسائل کا اس میں اضافہ کیا۔

سلسلہ تصنیف وتالیف بھی جاری رکھا۔ فہرست تصانیف حسبِ ذیل ہے:

۱۔ تشریح جعفری مصوّر۔ مطبوعہ امامیہ مشن لاہور، پاکستان
۲۔ تشریح عرفانی یا تعلیلی۔ مطبوعہ حی علی الفلاح سوسائٹی، علی گڑھ
۳۔ نور نظم انتخاب سراج نظم۔ مطبوعۂ ادارۂ ہمدانیہ، جلالی، ضلع علی گڑھ
۴۔ حکمائے قدیم کے تشریحی کارنامے۔ مطبوعہ دارِ اشاعت طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۵۔ تشریح الہیکل۔ مطبوعہ ترقی اُردو بیورو منسٹری آف ایجوکیشن آر کے پورم، نئی دہلی
۶۔ تشریح الاحشاء مطبوعہ " " " " " " " "
۷۔ اشراح حصہ اول ودوم وسوم۔ مطبوعہ دار الاشاعت طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۸۔ سراج منیر۔مطبوعہ ادارۂ ہمدانیہ، جلالی ضلع علی گڑھ

۹۔ اورادفتحیہ۔

۱۰۔ تاریخ الشیعہ میں قطب العارفین حکیم سید شاہ خیرات علی کا کارنامہ۔ مطبوعہ ادارہ ہمدانیہ، جلالی، ضلع علی گڑھ

۱۱۔ صاحب مودۃ القربیٰ (حضرت میر سید علی ہمدانی کی حیات وتعلیمات) مطبوعہ ادارہ مودت مالی گاؤں۔

۱۲۔ اخبارالکمال۔(تاریخ ساداتِ جلالی) غیر مطبوعہ۔

۱۳۔ مرقع عزاے جلالی۔

۱۴۔ اشجارالکمال۔(شجرہ سادات عابدی ہمدانی، مسکونہ جلالی)

۱۵۔ اسلامی اصولِ صحت۔مطبوعہ: حی علی الفلاح سوسائٹی، علی گڑھ

۱۶۔ علاج الامراض احادیث اسلامی کی روشنی میں۔مطبوعہ: حی علی الفلاح سوسائٹی، علی گڑھ

۱۷۔ امامیہ۔غیر مطبوعہ

۱۸۔ معصومیہ۔

۱۹۔ حجتہ اللہ۔

۲۰۔ کلام الکمال۔

۲۱۔ بیاض رباعیات۔

۲۲۔ دہ مجلس خرد۔مولفہ مولانا سید محسن علی اسیر حیدری الہمدانی۔مطبوعۂ ادارۂ ہمدانیہ جلالی، ضلع علی گڑھ

۲۳۔ دہ مجلس کلان۔مترجمہ مولانا سید محسن علی اسیر حیدری الہمدانی۔مطبوعۂ ادارۂ ہمدانیہ

جلالی، ضلع علی گڑھ

۲۴۔ قرآن اور علم الافلاک۔ مطبوعہ رنگ محل پبلی کیشنز، انصاری روڈ، مظفر نگر

۲۵۔ فکر نجات

۲۶۔ علامہ کنتوری اور طب۔ مطبوعہ ادارۂ ہمدانیہ، جلالی، ضلع علی گڑھ

۲۷۔ سفر نامہ علامہ کنتوری۔ 〃 〃 〃

۲۸۔ منثورات علامہ کنتوری۔ 〃 〃 〃

۲۹۔ افادات علامہ کنتوری۔ 〃 〃

۳۰۔ خاندان علامہ کنتوری۔ غیر مطبوعہ۔

۳۱۔ کتابیات کلیات۔ مطبوعہ ادارۂ ہمدانیہ، گڑھی جلالی، ضلع علی گڑھ۔

۳۲۔ مقدمہ تفسیر قرآن۔ غیر مطبوعہ

۳۳۔ طبی جغرافیہ۔ پبلیکیشنز ڈیپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۳۴۔ ترجمہ ضریری۔ غیر مطبوعہ

۳۵۔ مطب مسیح۔ مطبوعہ ادارۂ ہمدانیہ، گڑھی، قصبہ جلالی، ضلع علی گڑھ

۳۶۔ مطب لطیف۔ پبلیکیشنز ڈیپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۷۔ علاج السموم۔ غیر مطبوعہ

۳۸۔ یازدہ مجلس۔ مؤلفہ میر حسن دہلوی۔

۳۹۔ اصولِ طب۔ حصہ اول و دوم سوم و چہارم و پنجم۔ ادارہ ہمدانیہ، گڑھی قصبہ جلالی، ضلع علی گڑھ

۴۰۔ تذکرہ اطبائے اودھ جو آپ کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند پروفیسر عزیز الدین حسین نے ادارہ ادبیات دلّی سے شائع کیا۔

۲۸؍فروری ۱۹۸۹ء کو ریٹائر ہوئے اور حسن خدمات کے سلسلے میں ۱۵؍ جولائی ۱۹۹۰ء تک ری ایمپلائمنٹ بحیثیت پروفیسر اِن کلیات مزید رہے۔

مذکورہ تصانیف کے علاوہ متعدد تحقیقی مقالات بھی لکھے۔ جنھیں طبی کانفرنسوں، سیمیناروں اور آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے علمی اجلاسوں میں پیش کیا، نیز متعدد مقالات ومضامین ہندوستان کے طبی اخبار ورسائل مثلاً ہمدرد دہلی، حسنِ صحت کلکتہ، نوائے صحت الہٰ آباد نیز طبیہ کالجوں کی میگزینوں میں شائع ہوئے اور دینی مضامین دینی اخبارات ورسائل مثلاً سرفراز لکھنؤ، صدائے جعفریہ حیدرآباد، حسینی دنیا نئی دہلی، الواعظ لکھنؤ، الجواد بنارس، الارشاد بڈگام کشمیر، النجاۃ حی علی الفلاح، جعفریہ سوسائٹی علی گڑھ اور شیعہ لکھنؤ میں شائع ہوئے۔

آخر کار ۲۱؍فروری ۲۰۰۶ء مطابق ۱۴۲۷ء بروز سہ شنبہ (بدھ) بوقت دس بجے صبح جلالی کا یہ درخشندہ چاند اس دنیا سے اس دنیا کی روشنی کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ راقم نے تاریخ وفات کے ذریعے اس غم میں شرکت کرتے ہوئے اہل خانودہ کو تسکین وصبر کی تلقین کی۔

مدبر، شاعر وناقد، طبیب وعابد ومونس
وفاداری، غزاداری، خوش اخلاقی تھی فطرت میں
تھی اکس فروری غمگین سہ شنبہ دس بجے دن میں
شہادت پائی ہے آل محمدؐ کی محبت میں
یہ سچ ہے مرچکے ہیں وہ مگر یہ بھی حقیقت ہے
وہ زندہ ہیں مقالوں میں، کتابوں میں، شرافت میں
پئے تسکین کہا رضوان نے ہجری سنہ میں کیا غم ہے
چلو دیکھو: کمال الدین حسین آتے ہیں جنت میں

۱۴۲۷ھ

خاکسار کی پہلی ملاقات رضا لائبریری رامپور میں ہوئی تھی، ۱۹۸۶ء میں جب احقر پر ڈاکٹر بننے کا بھوت سوار تھا۔ ان دنوں اس کتاب خانے میں اتنی سہولیات دستیاب نہیں تھیں جتنی آج ہیں کسی مخطوطے کا حاصل کرنا کوہکنی سے کم نہ تھا۔ لگن ایسی تھی کہ حکیم شفا صاحب کے مشورے سے لکھنؤ جا کر خود گورنر سے ملاقات کی وہاں سے D.M کے یہاں خط آیا اس کے بعد ہفتہ میں ایک دن کے لئے .S.D.M کی ڈیوٹی لگائی گئی جو مخطوطات کے کمرے کی سیل توڑ کر اسی دن مخطوطات مطالعے کے لئے دیتا تھا اور شام کو دوبارہ سیل کر کے چلا جاتا تھا۔ ایسے میں مخطوطہ حاصل کرنے کے بعد ایک لمحہ بھی آرام حرام تھا۔ اتفاق سے اس دن کتب خانے میں کارکنوں کے علاوہ ہم دو ہی اشخاص تھے جو اپنے اپنے مخطوطہ حاصل کرنے کے بعد نظر جمائے نوٹس بنائے چلے جاتے تھے۔ تقریباً آدھا دن گزر جانے کے بعد آنکھوں نے آرام کی ضرورت محسوس کی تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں مسلم یونیوسٹی کے طبیہ کالج کے ڈائرکٹر سے ہم کلام ہوں۔ ظاہر ہے اتنی بڑی شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن جب گفتگو کا آغاز ہوا تو شفقت اور محبت بھرے لہجے میں گفتگو کے انداز نے یکسر بھلا دیا کہ اس وقت ایک بڑے دانشور محور گفتگو ہیں۔ میرے کام کرنے کے انداز پر مجھے کئی نصیحتیں کیں اور کارآمد مشوروں سے نوازا۔ مخطوطہ پڑھنے سے قبل سرورق اور آخری ورق پر نظر ڈالنے کی اہم تکنک سے روشناس ہوا۔ غرض چند منٹوں میں اپنے مشاہدات اور تجربات سے اس طرح فیض یاب کیا کہ آج بھی جب کوئی مخطوطہ ملتا ہے تو حکیم صاحب کا سنجیدہ صفت مسکراتا ہوا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ کیوں کہ انھیں نقوش پر آج تک کام کر رہا ہوں جو حکیم صاحب نے بتائے تھے۔ تقریباً ایک سال کے بعد حکیم صاحب سے دوسری ملاقات ان کے ایک شاگرد حکیم غلام مہدی راز صاحب کے دولت کدہ پر ہوئی جہاں ۱۳ر رجب کو مولا علیؑ کی ولادت کے سلسلے میں ایک طرحی مقاصدے کا اہتمام

کیا گیا تھا۔ حکیم صاحب اس مقاصدے کی صدارت فرما رہے تھے۔ میں یہاں بے بلایا مہمان تھا۔ کیونکہ میرے میزبان بھائی توصیف حیدر صاحب رازؔ صاحب کے دوست تھے۔ بھائی کے حکم پر میں نے ایک قصیدہ لکھ لیا اور سننے کے ارادہ سے مقاصدہ میں حاضر ہو گیا۔ حکیم صاحب کو مسند صدارت پر دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی جنھوں نے سلام کے جواب کے ساتھ ہی فوراً بڑی شفقت کے ساتھ اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب خاکسار کی پہچان دہلی میں نہ تھی۔ صدر محفل کا التفات دیکھ کر ظاہر ہے اہل محفل کا متوجہ ہونا لازمی تھا۔ حکیم صاحب کو معلوم تھا کہ میں شاعر ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ حکیم صاحب بھی شاعر ہیں کیونکہ بڑے لوگ اپنی شخصیت کو اجاگر نہیں کرتے لیکن میری دانشوری کا تو آغاز بھی نہیں ہوا تھا اسی لئے میں جتنا تھا اس سے کہیں زیادہ خود کو عیاں کرنے کی جستجو کر چکا تھا۔ لہذا صدر محفل حکیم صاحب کا حکم کچھ بھی سنانے کا ہوا میرے پاس طرحی قصیدہ تھا ہی سنایا تو سب سے زیادہ داد حکیم صاحب سے پائی ایک شعر دوبارہ بھی پڑھوایا جو اس لیے تحریر کیا جا رہا ہے تا کہ طرح کا اندازہ ہو سکے۔

تھی عقل و خرد اس پہ بہر حال تصدق　　کہتے ہیں کہ بہلول تھا دیوانہ علیؑ کا

آخر میں حکیم صاحب کا کلام سننے کو ملا۔ قصیدہ تمام روایتوں اور رعایتوں کی پابندی کے ساتھ کہا گیا تھا۔ جس میں تشبیب، گریز، مدح، دعا اور مدعا سب کچھ موجود ایک ایک شعر کے الفاظ موتیوں کی طرح پروئے گئے تھے۔ حکیم صاحب کی ایک شان یہ بھی تھی کہ جب وہ کسی لائبریری کا کیٹ لاگ دیکھتے تو ان کو یاد رہتا کہ اس کیٹ لاگ میں کس کے مقصد کا کیا مواد موجود ہے۔ اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر چند اشارے اس کے لیے درج کر کے کسی نہ کسی طرح پہنچوا دیتے یا کوئی تحریر فارسی یا عربی کی پسند آجاتی تو عوام تک اس تحریر کو پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اس ذیل میں رضا لائبریری رامپور میں موصوف کو

ایک نوحہ فارسی میں مولوی منصور شاہ خان کا دکھائی دیا۔ حکیم صاحب ایسے عاشق حسینؑ تھے کہ عزاداری کو جزو زندگی گردانتے تھے۔ فوراً نوحے کی نقل کر کے اپنے فرزند پروفیسر محمد عزیز الدین حسین ہمدانی کے ذریعہ خاکسار کو اس حکم کے ساتھ روانہ کی کہ اس کا اردو ترجمہ کر کے مخطوطے کے ساتھ کتاب کربلا میں شائع ہو۔ حکیم صاحب کی تعمیل ہوئی اور جب منظوم ترجمہ دیکھا تو بے حد خوش ہوئے اور حوصلہ بڑھانے کے لئے مندرجہ ذیل عبارت اپنے قلم سے درج کی۔ یہ ترجمہ مع حکیم صاحب کی عبارت کے 'اصلاح' جنوری، فروری ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں صرف حوصلہ برھانے کے لئے لکھی گئی حکیم صاحب کی عبارت بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے:

''فارسی نوحہ کا منظوم ترجمہ (جناب عراق رضا زیدی) کے قلم سے موصول ہوا۔ میری نظر میں منظوم اردو ترجمہ آپ کے ترجمے سے زیادہ بہتر ممکن نہیں ہے۔ خداوند عالم نظر بد سے محفوظ رکھے۔ آپ کی مہارت کا تو میں دل سے قائل ہو گیا۔ پروردگار عالم آپ کو جزائے خیر سے نوازے۔ نوحے کے ساتھ آپ کا کہا ہوا منظوم ترجمہ بھی کتاب کربلا میں یادگار رہیگا۔''

میں کتنی صلاحیت کا مالک ہوں اور میرا کیا ہوا ترجمہ کس پائے کا ہے یہ میں خوب جانتا ہوں۔ لیکن حکیم صاحب نے میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے جو کچھ لکھا وہ میرے لئے سند سے کم نہیں فنی مہارت کا قائل ہونے میں جو مقصد اور پیغام چھپا ہوا تھا وہ یہ کہ آپ کوشش کیجئے اور اس طرح کے ترجمے کرتے رہئیے۔ اس عبارت نے حوصلہ بڑھایا اور اقبال کے خاصے فارسی اشعار کا ترجمہ کیا اور یہ کام ہنوز جاری ہے۔ اہل بیت سے متعلق اقبال کے فارسی کلام کے ترجمے کا جتنا ثواب میرے حصے میں آئے گا اس سے زیادہ کے مستحق خود حکیم

صاحب ہوں گے۔ کیونکہ ایسے ترجموں سے قبل مجھے ان کی تحریر ضرور یاد آجاتی ہے۔ خدا جنت عدن میں بفیض محمد وآل محمد مرحوم کے درجات بلند کرے۔ آمین۔!

حکیم صاحب کے انتقال کی خبر نے دل پر بجلی گرانے کا کام کیا۔ بہت دیر تک تو کانوں کو یقین ہی نہ ہوا لیکن دماغ نے بڑھ کر کہا موت تو برحق ہے مگر ایسے لوگ مرتے نہیں ہیں۔ حدیث رسول خدا نے سہارا دیا۔

محمد وآل محمد کے عشق میں مرنے والے شہید ہوتے ہیں اور شہیدوں کے لیے قرآن نے کہا ''انھیں ہرگز ہرگز مردہ نہ کہو یہ تو زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی طرف سے رزق پاتے ہیں۔'' دل کے جذبات ذہن تک پہونچے تو کچھ اشک افشانی کے ساتھ ایک قطعہ تاریخ صفحہ قرطاس پر نمودار ہوا جو تذکرہ اطبائے اودھ میں شائع ہوا۔ مرحوم کے انتقال کے بعد لائق وفائق فرزند ارجمند جناب پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی صاحب نے

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

کے مصداق حکیم صاحب کے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور سب سے پہلے اپنے والد کی تدوین وتحریر کی گئی کتاب ''تذکرہ اطبائے اودھ'' کو طباعت کی منزلوں سے گزارا۔ اس طرح ایک بڑا کام اور بڑے نام اس کتاب کے ذریعہ سے زندہ ہوگئے۔ اس کتاب میں سوا چار سو سے زیادہ اطباء کا ذکر ملتا ہے۔ جنھیں جداگانہ شہر، قصبوں یہاں تک کہ خاندانوں میں بھی منقسم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں تذکرہ نویسی کے فن کے علاوہ تاریخ اودھ اور اس کے جغرافیہ سے بھی بحث کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم کمال الدین حسین تاریخ دان ہونے کے ساتھ ساتھ جغرافیے سے بھی خاصہ لگاؤ رکھتے تھے۔ زبان نہایت سادہ، سلیس اور موجودہ دور کے عوامی ذوق کو دیکھتے ہوئی نہایت آسان اردو کے الفاظ سے مزین ہے جو حکیم وطبیب، شاعری سے شغف رکھتے تھے ان کا نمونہ کلام بھی دیا گیا

ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے سے جو خط و کتابت ہوتی تھی ان حضرات کے خطوں کے نمونے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں جو نہایت کارآمد ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ جو پروفیسر عزیز الدین صاحب نے ''تذکرہ اطبائے اودھ'' کا ایک نسخہ میرے حوالے کیا تو میں نے چیدہ چیدہ استفادہ کرتے ہوئے فوراً کہا کہ کہیں نہ کہیں اسی طرح کا ایک اور تذکرہ ہونا چاہئیے۔ کیونکہ جب میں پٹیالہ میں تھا تو حکیم صاحب نے پنجاب کے اطباء کے حالات جاننے کے بارے میں کئی خطوط روانہ کیے تھے۔ خصوصاً حکیم دلبر حسین صاحب سے متعلق اطباء کا احوال دریافت کیا تھا۔ حکیم دلبر حسین صاحب نے ایک طبیہ کالج پٹیالہ میں کھولا تھا جس سے فارغ کئی حکیم اور ڈاکٹر پنجاب میں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ آزادی کے بعد یہ طبیہ کالج بھی نیست و نابود ہو گیا۔ جس کی پہلی بلڈنگ ابھی تک نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس طبیہ کالج کے پرنسپل حکیم اصغر علی صاحب تھے۔ ۹۷-۹۶ء میں حکیم صاحب کی تحریک پر میں اس کالج سے فارغ پانچ ڈاکٹروں سے ملا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے عروضی استاد حکیم (ڈاکٹر) اوم پرکاش اگروال رازؔ علامی بھی اسی طبیہ کالج سے فارغ تھے اور دلبر صاحب کے براہ راست شاگرد تھے۔ تقریباً ۲۵ اطباء کے احوال اور ان کے تشخیص کیے ہوئے نسخے خاکسار نے روانہ کئے تھے۔ ظاہر ہے یہ بھی کسی نہ کسی کتاب یا مضمون کی زینت بنے ہوں گے۔ امید ہے یہ کتاب بھی منظر عام پر آئے گی۔ حکیم صاحب کو اپنے بزرگوں کی طرح اپنے وطن جلالی سے بہت زیادہ محبت تھی ادارہ ہمدانیہ کی لائبریری کو برابر دیکھتے رہتے۔ جو مخطوطہ پسند آجاتا اسے زیور طباعت سے آراستہ کر دیتے۔ اسی ذیل میں ''دہ مجلس'' جو مولانا سید محسن علی صاحب امیر جلالوی الہمدانی کی تحریر کردہ تھی اسے ادارہ ہمدانیہ گڈھی قصبہ جلالی سے ایک مختصر مقدمہ تحریر کر کے شائع کیا۔ حکیم صاحب کا چار صفحات کا تعارف ایک طرح سے کوزہ میں سمندر سمانے کے مترادف ہے۔ یہاں اس کے

چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

''دہ مجلس'' ایک قدیم رسم عزا روضہ خوانی سے متعلق ہے
اور عزاداری کی قدامت کی ایک بین شہادت ہے۔''

اس ایک جملے میں ''دہ مجلس'' اور عزاداری کی تاریخ پر سیر حاصل بحث ہوگئی ہے۔
اس کے بعد جلالی کا تذکرہ اس ذیل میں اس طرح کیا گیا ہے:

''احقر کے وطن جلالی میں بھی دہ مجلس بزبان فارسی زمانہ قدیم
میں جاری تھی انھیں میں سے ایک نسخہ مولانا سید میر علی صاحب کا نقل کردہ
۱۲۴۰ھ کا بھی ہے، جس کا ترجمہ بزبان اردو آپ کے فرزند جناب مولانا
سید محسن علی صاحب امیر جلالوی (متوفی ۱۷/ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ) نے فرمایا
تھا۔ جلالی میں یہ بڑی دہ مجلس کے نام سے مشہور ہے اور عشرہ محرم کی مجالس
میں پڑھا جاتا ہے۔''

مندرجہ بالا چند سطور میں جلالی کی محرم داری، نسخہ کے مصنف اور ترجمہ نگار سے آشنا کرادیا گیا ہے۔ اور آخر میں اپنی محنت کا صلہ اس طرح چاہا ہے:

''امید ہے کہ وہ مجلس کے اس نسخہ کے ذریعے رسم روضہ خوانی
جو ایک قدیم ایرانی رسم عزا ہے۔ ان بستیوں میں جاری رہے گی جو
عزاداری کے لیے قدیم سے مشہور ہیں۔''

حکیم صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ''یازدہ مجلس'' مؤلفہ میر حسن دہلوی کی اشاعت بھی ہے۔ شہنشاہ مرثیہ اور اردو شاعری کے بزرگ ترین شاعر سید میر ببر علی انیس کے دادا میر حسن اپنی شہرہ آفاق مثنوی ''سحر البیان'' کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں وہ اردو ادب کے بیشک سب سے بڑے مثنوی نگار ہیں۔ انھوں نے مرثیے بھی لکھے لیکن ان کے بیٹے میر خلیق

اورخصوصاً پوتے میرانیسؔ نے اس میدان میں اس طرح شہسواری کی کہ ان کا مدمقابل سوائے مرزادبیرؔ کے کوئی نہ رہا۔ ''یازدہ مجلس'' بھی اردوادب کا ایک گراں مایہ سرمایہ ہے۔ اگراس کی نثر عام ہوجاتی تو شاید میرامن کی باغ وبہار کے ساتھ اس کتاب کے حوالے بھی عام ہوتے۔ غرض کہ اس کتاب کی اشاعت اردوادب کے ابتدائی نثری سرمایہ میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جو اپنے بزرگوں کی قدر نہیں کرتا یا انھیں یاد نہیں رکھتا۔ اسے زمانہ خود بھی یاد نہیں رکھتا حکیم صاحب یوں تو سید ہونے کے ناطے رسول خدا، جناب فاطمہ زہرا اور مولاعلیؑ کی اولاد میں ہیں۔ یہ وہ معجزاتی اور متبرک نام ہیں جن کا شجرے میں شامل ہونا ہی زندگی کی علامت ہے۔ لیکن ہندوستان میں آپ کے جد سید علی ہمدانی کی آمد نے کشمیر اور اہل کشمیر کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا تھا کہ آج بھی کشمیر، اہل کشمیر اور سید علی ہمدانی لازم وملزوم ہیں۔ ان کو کشمیر میں شاہ ہمدانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حکیم صاحب نے ایک کتاب ''صاحب مودت القربیٰ'' کے نام سے تحریر کی جس میں تاریخوں اور تذکروں کے حوالوں سے سید علی ہمدانی کے احوال وآثار پر مدلل روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ جداعلیٰ سید علی ہمدانی سے، ان مورث اعلیٰ جو جلالی میں تشریف لائے تھے میر سید کمال الدین حسین تک اور ان کے بعد خود تک جو بھی اجداد منفرد صفات کے حامل ہوئے ہیں ان کا تذکرہ تحریر کیا ہے۔ یہ ایک ایسی معلوماتی کتاب ہے جو حکیم صاحب کی خاندانی وراثت اور ان کے بزرگوں کے علمی کارناموں کو جاننے کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ غرض کہ حکیم صاحب کے نثری کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں ہر فن نثر نگاری کے جوہر مل جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ حکیم صاحب مشہور اطباء کی طرح شاعری کا شوق بھی رکھتے تھے۔ رباعی، غزل، قصیدہ، سلام، نوحہ، مرثیہ، قطعہ غرض کہ ہر صنف سخن پر طبع آزمارہے ہیں۔

فارسی اوراردو زبان میں جوصنف سخن مشکل ترین مانی جاتی ہے وہ تاریخ گوئی ہے۔حکیم صاحب کوتاریخ گوئی سے خاصہ شغف تھا۔تاریخ گوئی کے بھی کئی جز ہیں مثلاً صوتی،معنوی اورسنین صوتی ومعنوی،صوتی کے علاوہ باقی دونوں طرح کی تاریخ گوئی کوتین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔سالم،تدخلہ اورتخرجہ،ایک تاریخ کلام پاک کی آیت سے بھی نکالی جاتی ہے جسے فالی کہتے ہیں۔یہ تاریخ کراماتی احساس کی حامل ہوتی ہے۔حکیم کمال الدین صاحب نے اپنے والد کی وفات پرکئی تاریخیں برآمد کی ہیں جن میں سے ایک فالی بھی ہے۔آپ کے والدحکیم سید محمد ریاض الدین حسین عرف احسن صاحب کی وفات ۱۳۹۷ھ میں ہوئی تھی۔جن کی فالی تاریخ مشہورقرآنی آیت ''ورفعنا لک ذکرک'' سے ۱۳۹۷ھ برآمد ہوتی ہے۔اس کے علاوہ مرزاغالب کے انتقال پرجولاجواب مرثیہ ان کے شاگردمولانا حالی نے کہا تھا۔تقریباًاسی کے جواب میں قطعہ تاریخ وفات صنعت تعمیہ میں موزوں کیا ہے۔حالی کامطلع تھی:

بلبل ہند مرگیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

حکیم صاحب کے اشعار ملاحظہ کیجئے اگر یہ اشعار مولانا حالی کے لکھے گئے مرثیہ میں شامل کردئے جائیں تواہل دانش کو یہ امتیاز کرنا مشکل ہوگا کہ حکیم صاحب کے اشعارکون سے ہیں اورحالی کے اشعار کی شناخت کیسے ہو،سوائے اس کے کہ غالب مشہور شاعر ہیں اورحکیم سید محمد ریاض الدین صاحب ایک طبیب بس انھیں الفاظ کی مماثلت سے کچھ پہچان ہوسکتی ہے۔ایک قطعہ تاریخ اس طرح ہے:

عارف راز مخزن عرفان مرد حق محرم رموز حیات
اپنے خالق سے جا ملا آخر چھوڑ کر یہ جہان مکروہات

بے ''کم وبیش'' ہے یہی تاریخ
پاک دل پاک ذات پا ک صفات

آخری مصرعہ مولانا حالی کا ہے جس کے اعداد ۱۷۷۵ ہوتے ہیں۔صنعت تعمیہ کی رو سے تجزیہ کا عمل کر کے پہلے مصرعہ کے اشارے بے ''کم وبیش''، یعنی کم وبیش کے ۳۷۸ عدد کم کر کے تاریخ برآمد کی جاسکتی ہے اس طرح ۱۷۷۵ میں سے ۳۷۸ عدد کم کرنے پر ۱۷۷۵-۳۷۸=۱۳۹۷ عدد برآمد ہوجاتے ہیں جس سے سال تاریخ وفات برآمد ہوتا ہے۔اسی طرح دوسرا قطعہ بھی حالی کے اسی مرثیہ کے ایک اور بند سے مختص ہے:

قلب حکمت کا سوگوار ہے آج
علم کی آنکھ اشکبار ہے آج
ماہر فن طب ہوا رخصت
دل اطبا کا داغدار ہے آج
ذات احسن بڑی غنیمت تھی
تشنۂ علم یہ دیار ہے آج
رونق افروز تھے جہاں پر آپ
رخصت اس باغ سے بہار ہے آج
قدر تہذیب ان کے دم سے تھی
روح تہذیب بیقرار ہے آج

غرض کہ زبان وبیان اور بحروزن پر ایسا تصرف کم ہی شاعروں کے حصے میں آتا ہے۔انیس ودبیر کے مرثیہ گوئی کا فن نہایت مشکل ودقیق فن مانا جاتا ہے۔مرثیہ لکھنے والوں کی تعداد تو رباعی گو شاعروں سے بھی کم دیکھنے کو ملتی ہے۔حکیم صاحب نے اس طرف بھی

اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ۶۸ بند کا ایک مرثیہ پروانے کی صفت کو نظر میں رکھتے ہوئے موزوں کیا ہے۔ پروانے کی صفت سے بچہ بچہ واقف ہے۔ اور پروانوں کو شمع کے عشق میں جلتے ہوئے شب و روز دیکھتا رہتا ہے۔ کربلا میں امام حسین شمع کی مانند تھے اور ان کے چاہنے والے راہ خدا میں دین محمد کو بچانے کے لیے اس شمع کے گرد پروانوں کی طرح جان دینے کے لیے تیار تھے۔ امام انھیں دور جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اور وہ پروانہ صفت جان دینے کے لیے آمادہ تھے۔ مرثیہ کے چند بیت ملاحظہ کیجئے۔

کربلا میں شب عاشورہ یہ مجلس تھی عجیب　　شاہ مسند پہ تھے اور گرد تھے سب شہ کے حبیب
خیمۂ شہ میں مؤدب تھے سبھی اہل نجیب　　ہر طرف ایک اداسی تھی پریشان تھے غریب
حاضر انصار بہ تہذیب غلامانہ تھے
شمع دین نبوی شاہ وہ پروانہ تھے

جذبۂ عشق سے معمور ہوں پروانے وہ　　اور ہر اک حال میں مسرور ہوں پروانے وہ
فطرت حق پہ جو مجبور ہوں پروانے وہ　　شمع کی چاہ پہ مغرور ہوں پروانے وہ
ایسے پروانے کوئی شمع جنھیں پا نہ سکے
لاکھ ڈھونڈے پہ مثال ان کی کوئی لا نہ سکے

رہ الفت میں جو جرار ہوں پروانے وہ　　جان سے اپنی جو بیزار ہوں پروانے وہ
ہر ستم سہنے کو تیار ہوں پروانے وہ　　عشق میں میثم تمار ہوں پروانے وہ
قلب میں جذبہ ایثار و وفا رکھتے ہوں
راہ حق پہ ہو نظر خوف خدا رکھتے ہوں

جس مرثیہ سے یہ بند ماخوذ ہیں اس کا مطلع بھی سن لیجئے۔ جس پر فیض احمد فیض کے مرثیہ کی جھلک بہت صاف نمایاں ہے۔ فیض نے کہا تھا ع

رات آئی ہے شبیر پہ یلغار بلا ہے

حکیم صاحب فرماتے ہیں۔

شب آشور عجب کرب وبلا کی شب تھی

یہاں ''یلغار بلا'' کی جگہ ''کرب وبلا'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے دو معنی نکلتے ہیں ایک معروف جگہ کا نام جو دراصل ''کربلا'' ہے۔ لیکن اسے مرکب بنا کر کرب اور بلا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس مرثیہ کے بارے میں خود کمال صاحب نے ''پروانہ'' کے موضوع بنانے کے لیے توجیح بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''استاد قمر جلالوی نے شب عاشورہ کے حالات پر اپنے تصنیف کردہ مرثیہ میں ''لفظ چراغ'' سے استفادہ کیا۔ احقر نے اپنے مرثیہ میں لفظ ''پروانہ'' سے استفادہ کیا ہے۔''

اب ذرا متذکرہ پہلے بند کی بیت ملاحظہ کیجئے:

حاضر انصار بہ تہذیب غلامانہ تھے
شمع دین نبوی شاہ وہ پروانہ تھے

پروانہ کی مجازی صفت سے تو دنیا آشنا ہے۔ یہاں بطور مثال صرف ایک شعر قلم زیدی کا تحریر کیا جاتا ہے ۔

خود شمع بنیے اور مجھے پروانہ کیجئے
کہتا ہے کیا زمانہ یہ پروا نہ کیجئے

یہ مجازی کیفیت ہے جہاں مخلوق خدا سے خوف کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ اس کے برعکس جب انسان عشق حقیقی میں گم ہو جاتا ہے تو اسے راہ خدا میں سوائے خدا کے کسی کا خوف نہیں رہتا۔ جہاں تک خاکسار کے مطالعے کا تعلق ہے تو پہلی بار ایسی ترکیب دیکھنے کو ملی ہے

جہاں ''غلامانہ تہذیب'' کی بات کی گئی ہے۔ گو کہ انصار حسینؑ خود امام حسینؑ کی نگاہ میں قدر عظیم کے مالک تھے۔ اس کے باوجود خود لشکر امام حسینؑ کے سالار اعظم علمبردار غازی حضرت عباسؑ ہمیشہ خود کو امام کا غلام سمجھتے رہے اور جب بھی سامنے آئے سوائے آقا کے کچھ نہ کہا۔ حالانکہ وہ تو امام حسینؑ کے حقیقی برادر تھے۔ اور قمر بنی ہاشم کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ جب اولاد علیؑ کا یہ حال ہے تو اندازہ لگائیے کہ باقی انصار حسینؑ بھی اپنے امام کے سامنے اسی تہذیب کا مظاہرہ کررہے تھے یعنی انصار امام، امام کے آس پاس ''تہذیب غلامانہ'' کے زیر اثر جان دینے کو تیار تھے۔ یہاں وقت کم ہے ورنہ اس دور کے غلاموں کی جو کیفیت ہے حالانکہ ہر قدم پر محبت اور ولا گامزن ہے۔ اس کے باوجود ''تہذیب غلامانہ'' کے پس منظر میں بات کو سمجھنا ہی زیادہ بہتر رہے گا۔ اب اس غلامانہ تہذیب کی وجہ بیان کی گئی ہے جس کے لئے واضح کیا گیا کہ نور ''شمع دین نبوی شاہ'' گویا امام حسینؑ کی عظمت کی ایک بنیاد ''دین محمد کی شمع'' ہونا ہے۔ یہاں ''غلام'' لفظ سے متعلق ایک شعر محبوب حیدر محبوب کا لکھنا چاہوں گا تا کہ عوام غلامی کا کوئی دوسرا مطلب نہ نکالیں۔

تمہارے غلاموں کے در پہ بھی آقا
جھکے بادشاہوں کے سر دیکھتے ہیں

اور نتیجتاً ان کا کردار و عمل اتنا بلند ہو کہ ان کی نس نس میں محبت خدا، محبت رسول اور محبت آل رسول رچی بسی ہوئی ہو اور وہ:

قلب میں جذبہ ایثار ووفا رکھتے ہوں
راہ حق پہ ہو نظر خوف خدا رکھتے ہوں

مقالہ کو طوالت سے بچانے کے لیے اس سے زیادہ نقد کی ضرورت نہیں ہے اس کے باوجود تلمیحاتی نظام کی ایک جھلک ضرور دکھائی جارہی ہے۔ یوں تو کربلا مجسم ایک اہم

تلمیحاتی نظام کا محور بن چکی ہے۔لیکن اس عکس میں میثم تمار کے واقعے کی طرف اشارہ پروانہ صفت انصار کے حوصلوں کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے اور یہ مصرعہ:

عشق میں میثم تمار ہوں پروانے وہ

گویا ہاتھ پیر کٹ جانے کے باوجود جب آقا نے کہہ دیا ہے تو زبان کے کٹنے کا بھی انتظار ہے۔اور جب تک زبان نہ کٹی جان میں جان رہی اور تقریر جاری رہی۔ایسے ہی عشق کی معراج پر اصحاب حسینی فائز تھے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ حکیم کمال الدین حسین ہمدانی اپنے دور کی ایک عبقری شخصیت تھے۔ جو خود بھی متحرک رہے اور دوسروں کو بھی متحرک رکھنے کی کوشش کی وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے نظم ونثر کی جملہ اصناف پر کامل دسترس رکھنے کے باوجود کبھی دوسروں کو ذلیل کرنے کی کوشش تو کیا اس طرف توجہ بھی نہیں کی۔وہ ایک ہی وقت میں ایک اچھے طبیب، پرگو شاعر، محقق، مدبر، تاریخ داں، مخلص اور ادب نواز تھے۔ان کی موت کے لیے بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

'موت العالم موت العالم'